R. No. 2186/57

Regd. No. L. 922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Date
1-8-15-22

Phone—29
Annual Rs. 5/-
per Copy-15 P.

جلد ۲۷۔ شمارہ ۱۷ | ایڈیٹر آل احمد سرور | یکم مئی ۱۹۶۸ء

اداریہ

انجمن کے تازہ فیصلے اور اردو گھر کی تعمیر کی مہم

۱۰ اپریل کو انجمن کی ادبی مجلس، مالی مجلس اور مجلس عاملہ اور مجلس عام کے جلسے ہوئے۔ اس میں بمبئی، حیدرآباد، سری نگر، دہلی، رامپور اور اورنگ آباد سے ممبروں نے شرکت کی۔ ان جلسوں میں جو فیصلے ہوئے ان میں سے خاص خاص کی وضاحت ضروری ہے۔

(۱) غالب کی سویں برسی کے موقع پر انجمن حسب ذیل کتابیں شایع کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔

(۱) غالب کا سارا اردو کلام۔ مرتبہ امتیاز علی عرشی۔ دوسرا ایڈیشن۔

(۲) خطوط غالب مرتبہ مہیش پرشاد نظرثانی مالک رام دو جلدیں اس کی پہلی جلد انجمن کئی سال ہوئے شایع کر چکی ہے، مگر اب دونوں جلدیں اسی موقع پر شایع ہوں گی۔

(۳) غالب کے فارسی خطوط کا اردو ترجمہ از اکبر علی خاں

(۴) گنجینۂ غالب۔ مرتبہ مختار الدین آرزو

(۲) اردو تحریک کا جائزہ لینے اور شاخوں کی تنظیم کو بہتر بنانے کے لیے جولائی میں مجلس عام اور ریاستی شاخوں کے نمائندوں کا ایک مشترکہ جلسہ ہوگا جس میں علاوہ دوسرے امور کے ابتدائی منزل سے لے کر اعلیٰ منزل تک اردو کے ذریعے سے تعلیم کا ریاستی شاخوں کے ذریعے سے انتظام کرنے یا حکومت سے مناسب انتظام کرانے کا پروگرام تیار کیا جائے گا اور اس سلسلے میں کتابوں کی فراہمی، اساتذہ کی تربیت اور دوسرے متعلقہ مسائل پر بھی غور ہوگا۔

(۳) اردو گھر کے لیے عوام سے چندے کی اپیل کی گئی ہے اور اسی غرض سے بعض ریاستوں میں نمائندہ کمیٹیوں کی تشکیل کے لیے کنوینر مقرر کر دئے گئے ہیں۔ دہلی، بمبئی اور حیدرآباد جیسے بڑے شہروں میں چندے کے لئے خاص تہذیبی پروگرام بھی ہوں گے جو نمائندہ کمیٹیاں کریں گی۔ چندے کے لیے ہزار، پانچ سو، سو، پچاس، بیس، دس اور پانچ روپے کے چندے کی رسیدیں تیار کرائی جائیں گی اور چندہ کا اعلان ہماری زبان میں برابر ہوتا رہے گا۔ موجودہ نائب معتمد کے علاوہ ایک اور نائب معتمد چندے کی فراہمی کے کام کی نگرانی کرے گا اور اس سلسلے میں صدر، نائب صدر، سکریٹری اور مجلس عام کے ممبر خاص خاص مقامات کا دورہ بھی کریں گے۔ مجلس عام کا ہر ممبر ایک ہزار چندہ خود دیگا یا اپنے احباب سے دلوائے گا تاکہ دوسروں سے چندہ لے سکے۔

(۴) اردو گھر کی تعمیر کی فوری ضرورت ہے۔ انجمن کے پاس ڈیڑھ لاکھ روپیہ اس کام کے لیے موجود ہے۔ حکومت سے امداد کی بھی درخواست کی گئی ہے، مگر ابھی تک کوئی حوصلہ افزا جواب نہیں ملا ہے۔ حکومت یہ طے کر رہی ہے کہ عمارتوں کی تعمیر کے لئے فی الحال روپیہ نہ دینے کی پالیسی کے پیش نظر اس کام میں حکومت [illegible] نہیں کرسکے گی۔ ہم اس سلسلے میں حکومت کو پھر توجہ دلا رہے ہیں، مگر اس کے ساتھ ہمیں یہ بھی یقین ہے کہ ہماری مدد عام اردو دوست اور ہندوستان کی ہر زبان کی ترقی چاہنے والے حضرات ضرور کریں گے۔ عوام سے چندے کی درخواست صرف روپیہ جمع کرنے کے لئے نہیں بلکہ ان کو اردو گھر کے چلانے اور انجمن کے کاموں میں شریک کرنے، ان کی عملی ہمدردی حاصل کرنے، ان سے اپنا رشتہ مضبوط کرنے اور انجمن کو خود کفیل بنانے کے لیے ہے۔ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق ملک میں دو کروڑ تیس لاکھ اشخاص کی مادری زبان اردو ہے۔ اب تو یہ تعداد اس سے کہیں زیادہ ہوگی۔ انجمن ان سب کے جذبات و خیالات کی نمائندگی اسی وقت کر سکتی ہے جب اسے ان کا عملی تعاون حاصل ہو اور وہ اس کے سارے اخراجات کے کفیل ہوں۔ اپنے کاموں کے لیے حکومت سے مدد مانگنا ہمارا جمہوری حق ہے کیونکہ تمام ہندوستانی زبانوں کی ترقی اس کے فرائض میں شامل ہے اور اردو ان ہندوستانی زبانوں

میں اپنی تاریخ، اپنے چلن، اپنے ادبی سرمائے کی عظمت اور ہندوستانی زندگی کے ہر پہلو کی عکاسی کی وجہ سے ایک نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ مگر زبان و ادب صرف حکومتوں کے سہارے ترقی نہیں کرتے نہ حکومتوں کے دبانے سے پامال ہو سکتے ہیں۔ ان کی ترقی ان کے دھرتی سے تعلق، چلن سے رشتے، اس زبان کے بولنے والوں کے جذبے اور ان کی عملی صلاحیت پر موقوف ہے۔ اردو ہر لحاظ سے خوش قسمت ہے اس کے بولنے والوں کو اس سے محبت بھی ہے اور ان کے جذبے کی گرمی میں بھی کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں ہماری صلاحیتیں اب تک احتجاجی اور ہنگامی تحریکوں میں برباد ہوتی رہیں۔ احتجاج بھی ضروری ہے مگر احتجاج کافی نہیں جلسوں اور مظاہروں کانفرنسوں اور قراردادوں کی بھی اہمیت ہے مگر انہیں بھی سب کچھ سمجھنا غلط ہوگا۔ سب سے بڑی چیز اپنے آپ کچھ کرنے اپنے وسائل کو سلیقے سے استعمال کرنے اور ہر حال میں موجودہ دور کی ضروریات کے مطابق اپنے دائرہ عمل کو بڑھانا ہے۔ انجمن یہی کرنا چاہتی ہے اور اردو دوستوں سے اس کی یہ اپیل ہے کہ وہ اس اہم اور بنیادی کام میں اس کی مدد کریں۔ انجمن کا کسی دوسرے ادارے سے کوئی جھگڑا نہیں۔ انجمن صرف اپنے کو اردو کا ٹھیکے دار بھی نہیں سمجھتی۔ مگر یہ اردو دوستوں کی سب سے بڑی سب سے منظم اور سب سے زیادہ جانی پہچانی جماعت ہے اس میں یہ بھی نمایاں ہے۔ اس سے بہت سی غلطیاں ہوئی ہیں۔ کس سے نہیں ہوتیں۔ فرد ہو یا ادارہ غلطیوں سے کوئی پاک نہیں۔ اس کا سب سے بڑا قصور بعض لوگوں کے نزدیک یہ ہے کہ یہ راست اقدام کیوں نہیں کرتی اور یہ حکومت سے امداد کیوں لیتی ہے۔ راست اقدام کوئی ٹوٹکا نہیں ہے

کہ اس کا نام لینے سے مسئلے حل ہوتے ہیں۔ یہ اپنے مطالبات کو منوانے کے بہت سے طریقوں میں سے ایک طریقہ ہے۔ موجودہ حالات میں اور ملک کے سیاسی مزاج کو دیکھتے ہوئے انجمن کے نزدیک احتجاج کے دوسرے طریقوں کو آزمانا بہتر ہوگا۔ رہا حکومت سے امداد کا معاملہ تو یہ ہمارا جمہوری حق ہے۔ یہ ہمارا روپیہ ہے جو ٹیکسوں کے ذریعے ہم حکومت کو دیتے ہیں اور اس میں سے اگر کچھ رقم ہمیں مل سکتی ہے تو ہم کیوں اس حق سے دستبردار ہوں لیکن اس کی وجہ سے ہماری پالیسی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ انجمن کی مجلس عام کے چالیس ممبر ادیبوں، شاعروں، دانشوروں، استادوں اور ترقی کارکنوں پر مشتمل ہیں یہی چالیس ممبر اس کی پالیسی بناتے ہیں۔ نئے قواعد کے مطابق ان میں بارہ ریاستی شاخوں کے نمائندے بھی شامل ہوں گے۔ انجمن سارے مسائل کو ایک قومی پس منظر میں دیکھتی ہے۔ اس میں مختلف مذاہب کے مختلف سیاسی پارٹیوں کے اور مختلف پیشوں کے لوگ شریک ہیں۔ انجمن چاہتی ہے کہ اس کا اردو گھر جلد سے جلد بن جائے تاکہ اس کے دفتر کو وہاں منتقل کیا جائے اور پھر زبان و ادب کی خدمت زیادہ تندہی سے ہندوستان کی راجدھانی سے کی جاسکے۔ اس مشن کو کامیاب بنانا ہر اردو دوست کا فرض ہے اور ہمیں یقین ہے کہ اردو دوست اس معاملے میں ہماری توقعات کو پورا کریں گے۔

حرمت الاکرام

پیار کی بولی

ذوق تنظم پر اردو نے راہ انوکھی کھولی ہے
رنگ کی گہرائی نالی ہے پھول کی خوشبو ہولی ہے
یہ نازک جذبات کے ایسے اظہار کی بولی ہے
اردو پیار کی بولی ہے

گر ہائی تہذیب کی محفل چھکایا افسانے کو
رنگ بکھیرا آنچل آنچل روپ کا مان بڑھانے کو
شبدوں کے پیالے میں اس نے دل کی لالی گھولی ہے
اردو پیار کی بولی ہے

میر نے دل کی دھڑکن دی اقبال نے فکر کا نور دیا
غالب نے آغوش کو اس کی حسن ترتیب ودور دیا
جس پہ غزالوں کو رشک آئے اردو کی وہ بھولی ہے
اردو پیار کی بولی ہے

کرشن کے افسانوں کا جادو دلوں کا سودا کرتا ہے
جگر کا نغمہ آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کرتا ہے
پلوں سے کھلیانوں تک رقص میں دیوانوں کی ٹولی ہے
اردو پیار کی بولی ہے

گیت فراق کے جھل جھل کرتے ہیں مشعل کی طرح
وحشت کی بے سایہ فلک ہے ساون کے بادل کی طرح
کس میلے کا محل ہے یہ کس گوری کی ڈولی ہے
اردو پیار کی بولی ہے

ساقی فاروقی کا مجموعہ کلام "پیاس کا صحرا" شائع ہوگیا

ادبی حلقوں میں یہ خبر مسرت کے ساتھ سنی جائے گی کہ پاکستان کے مشہور و مقبول جدید شاعر ساقی فاروقی کا مجموعہ کلام شائع ہوگیا ہے۔ اس مجموعہ میں ساقی فاروقی کی منتخب غزلیں اور نظمیں شامل ہیں۔ اس مجموعہ کو کتاب نما، راولپنڈی نے شائع کیا ہے۔ ساقی فاروقی آجکل اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں لندن میں مقیم ہیں۔

(ایک نامہ نگار)

مظفر اقبال

اردو میں خواتین کا اولین ناول ــ اصلاح النساء

(گذشتہ سے پیوستہ)

ان اقتباسات سے اس بات کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ رشیدۃ النساء ڈپٹی نذیر احمد کے ناول مراۃ العروس اور بنات النعش کے موضوع اور مقصد سے متاثر تھیں۔ اس بات کا مزید ثبوت اندرونی شواہد سے بھی مل جاتا ہے جس کی طرف ڈاکٹر اختر اورینوی نے بھی اشارہ کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اصلاح النساء پر نذیر احمد کے ناولوں میں مراۃ العروس (۱۸۶۹ء) بنات النعش (۱۸۷۲ء) اور توبۃ النصوح (۱۸۷۷ء) کے اثرات نمایاں ہیں لیکن مصنفہ کا یہ دعویٰ بھی اپنی جگہ پر صحیح ہے کہ:

"میرے لکھنے میں عمدہ بات یہ ہوگی کہ اس کتاب کے پڑھنے سے عورتوں پر اثر زیادہ ہوگا اور سمجھیں گی کہ اس نے عورتوں کی رسموں کو جہاں تک لکھا ہے آنکھ دیکھی بات لکھی ہے......."

(دیباچہ اصلاح النساء)

بلاشبہ رشیدۃ النساء کے بیانات میں نسبتاً زیادہ واقفیت اور صداقت نظر آتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اصلاح النساء میں مسلم گھرانوں کی معاشرت کی جو تصویریں پیش کی گئی ہیں وہ بالکل سچی اور جیتی جاگتی ہیں۔ مثال کے طور پر صرف ایک تصویر ملاحظہ ہو، مانجھے کی رسم کا بیان ہے:۔

"جمعہ کے دن تین بجے تک گھر میں بسم اللہ کی ماں کے ہاں مہمانوں کا ہجوم ہو گیا، گانے والیاں آئیں، گانا بجانا شروع ہوا، تین بجے لڑکی مانجھے بٹھائی گئی، بسم اللہ جس قدر زیور پہنے تھی سب اوتار دئے گئے یہاں تک کہ چوڑیاں بھی اوتار دی گئیں اور سات سہاگنوں نے ادبٹن اپنے اپنے گال سے چھڑا کر بسم اللہ کو لگایا، داہنے ہاتھ میں کنگنا باندھا گیا جس وقت یہاں رسمیں ہو رہی تھیں زنانے دروازے پر آدمی پکار رہے تھے کہ مانجھے کی چیزیں باہر بھیجو دیر ہوتی جاتی ہے مگر گانے بجانے کا اس قدر گھر میں غل تھا کہ کسی کے کان تک پکارنے والے کی آواز نہیں پہونچتی تھی بڑی دیر ہو گئی اور یہ لوگ چلا چلا کر تھک گئے، جب گانا موقوف ہوا تو باہر کے پکارنے والے کی آواز سن کر ایک ماما چلائی ہوئی دوڑی اے لو چپ رہو کتنا غل ہے، باہر کے لوگ کشتی مانگ رہے ہیں، میاں دروازے پر کھڑے ہیں اے لوگو چپ بھی رہو! اس ماما کے چلانے سے غل کسی قدر کم ہوا تو معلوم ہوا کہ باہر سمدھیانے جانے کی چیزیں مانگی جاتی ہیں۔ ایک چاندی کی چوکی، کشتیاں، خوانچے جو تیار ہوئے تھے وہ سب باہر جانے لگے، ایک کشتی میں دولہا کے لیے مانجھے کا جوڑا تھا، زرد رنگ کا انگرکھا مشروع کا پاجامہ زرد رنگ کا سرخ رنگ کا رومال جس کے چاروں طرف گوٹا لگا ہوا، زری کی ٹوپی زری کا جوتا بھاری کام کا، یہ سب چیزیں ایک کشتی میں تھیں اور پھول چنگیر بڑہ بدھی اور ہار تھے یہ سب چیزیں نہایت عمدہ تورہ پوش سے ڈھکی ہوئی تھیں، دوسری کشتی میں ایک تھال چاندی کی، اس تھال میں سات پینڈیاں اس میں ایک زرد رنگ کا کٹکنہ تھا کچھ کارچوبی کام کیا ہوا جو اسپند دانی دے کر بنایا گیا تھا اور اسی کشتی میں ایک دوسری تھالی میں سات بیڑے پان کے ورق نقرہ لگے ہوئے اور ایک کپی میں تیل چنبیلی کا جس کے منہ پر سرخ کپڑا گوٹا ٹنکا ہوا بندھا تھا، یہ سب چیزیں رکھ کر ایک تورہ پوش کشتی پر ڈال دیا، اس کے سوا کچھ خوانچے اور تھے جس میں گیارہ چینی کی پینڈیاں تھیں اور بہت سے خوانچے خالی تھے۔ ان میں تھوڑا تھوڑا صرف مٹھائیوں کا ڈال دیا تھا، یہ سب زینت کے لئے تھے، باجے کے ساتھ مانجھا روانہ ہوا اور باجے بھی ایسے مہیب آواز کے جس سے دل دھڑک جائے اور کانوں کو تکلیف پہونچے، بگے گاڑی کے گھوڑوں کی تعداد، اونٹ اور ہاتھی وغیرہ جو کرایہ پر منگائے گئے تھے سب ساتھ تھے سب کے پیچھے مانجھے کی چوکی کشتیاں اور خوانچے متعدد مگر اکثر خالی اگر خوان پوش کہیں ہوا سے اڑا تو حقیقت کھل گئی، مانجھے کے ساتھ کچھ شریف لوگ بھی تھے، اس تکلف سے مانجھا روانہ ہوا اور اس کے بعد سواریاں روانہ ہونے لگیں مکان محمد اعظم کا قریب تھا، سواریاں جلد جلد اوتر گئیں اور مانجھا کہیں شام کے وقت تمام شہر اور گلیوں سے گردش کرتا ہوا پہونچا...."

(اصلاح النساء حصہ اول صفحہ ۹ تا ۱۰)

جزئیات نگاری نے اس تصویر کو وہ رنگ و روغن عطا کیا ہے کہ آج بھی زندہ اور متحرک نظر آتی ہے۔ افسوس کہ ہمارے بلند پایہ ناقدین نے اصلاح النساء کے مطالعہ کی زحمت گوارا نہ کی ورنہ وہ رشیدۃ النساء کو بھی ان ہی الفاظ میں خراج عقیدت ادا کرتے جن الفاظ میں آل احمد سرور نے نذیر احمد کو ادا کیا ہے:۔

" اصلاحی سوسائٹی اور خاص کر اصلاحی خاندانوں

کی اندرونی معاشرت کی جو تصویریں نذیر احمد نے کھینچی ہیں وہ ایسی سچی اور بے داغ ہیں کہ آنکھوں کے سامنے نقشہ پھر جاتا ہے"

(مجاز، اردو نثر کا تاریخی سفر، ص ۔)

اصلاح النساء کا قصہ خاصا طویل ہے لیکن اس کی ترتیب و تنظیم میں کوئی الجھاؤ نہیں بلکہ سادگی اور صفائی ہے۔ یہ نذیر احمد کے اولین ناول مراۃ العروس اور بنات النعش کی طرح دو حصوں پر مشتمل ہے اور اس کے مرکزی کردار اشرف النساء اور بسم اللہ مراۃ العروس اور بنات النعش کے مشہور و معروف کردار اصغری اور اکبری سے بہت حد تک مشابہ ہیں لیکن قصہ کا محور اشرف النساء اور بسم اللہ نہیں بلکہ بی وزیرن ہیں جو بھولی بھالی پردہ نشین خواتین کو ٹھگنے میں ماہر ہیں حقیقت یہ ہے کہ اصلاح النساء بنیادی طور پر بی وزیرن ہی کی کہانی ہے حصہ اول میں یہ کہانی نامکمل رہ جاتی ہے اس لئے مصنفہ نے دوسرے حصہ کا اضافہ کیا ہے۔ اصلاح النساء کا قصہ اس اعتبار سے نہایت اہم ہے کہ اس میں انیسویں صدی کے اواخر میں ہندوستان کے مسلم گھرانوں کی معاشرت کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔

اصلاح النساء میں تقریباً ڈیڑھ درجن کردار ہیں مردوں میں محمد اعظم محمد مسلم، امتیاز الدین، میر محمد واسطہ، میر غلام علی اور رمضان علی مختار وغیرہ قابل ذکر ہیں اور عورتوں میں امتیاز الدین کی ماں، منیرن بیگم بسم اللہ، رحمت النساء، اشرف النساء، امیر النساء عرف لاڈلی، کریم النساء، شہزادی، سردار دولہن، گل چمن اور وزیرن کچھ نام اہمیت رکھتے ہیں بسم اللہ پر اکبری، لاڈلی پر نعیمہ اور اشرف النساء پر اصغری اور صالحہ دونوں کا سایہ نظر آتا ہے اور اس اعتبار سے ان میں کوئی جدت یا تازگی نہیں لیکن سب کی تلافی وزیرن کے کردار نے کردی ہے جس طرح اچھی سے اچھی غزل میں کوئی ایک شعر ہی حاصل غزل ہوتا ہے اسی طرح اصلاح النساء کے کرداروں میں صرف وزیرن کا کردار بہت ہی دلکش ہے اور یہ پورے ناول پر محیط ہے۔ بلاشبہ یہ کردار بہت ہی جیتا جاگتا اور زندگی کی توانائیوں سے بھرپور ہے۔

وزیرن ایک عیار اور پرفن عورت ہے جس کا ذریعۂ معاش ضعیف الاعتقاد عورتوں کو بیوقوف بنا کر اپنا الو سیدھا کرنا ہے۔ اس کام کو وہ بہت سلیقہ اور ہنرمندی سے انجام دیتی ہے عورتیں اس وقت تک اس کی معتقد رہتی ہیں جب تک کہ وہ خود ہی اپنے فریب کا پردہ چاک نہیں کرتی لیکن اس کے بعد بھی وہ اپنا دھندا ترک کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتی ہے یہاں تک کہ خواب سے متاثر ہو کر توبہ کرتی ہے اور پھر حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہو جاتی ہے، وزیرن کی طبیعت میں یہ عظیم انقلاب کسی مجبوری کے تحت نہیں آتا۔ وہ اپنے گناہوں کا اعتراف کسی خوف سے نہیں کرتی بلکہ اپنی تمام چالاکیوں اور عیاریوں کے باوجود وہ سردار دولہن کی خوش خلقی کے سامنے بے بس ہو کر اعتراف جرم کرلیتی ہے۔ اس اعتراف کے بعد اس کا نفس پھر اسے ورغلاتا ہے چنانچہ وہ سردار دولہن کے روبرو تو ظاہراً توبہ کرلیتی ہے لیکن دل میں کھوٹ باقی رہ جاتا ہے جسے دور کرنے کے لیے رشیدۃ النساء نے وہی طریقہ اختیار کیا ہے جو نذیر احمد نے توبۃ النصوح میں نصوح کے قلب ماہیت کے لیے استعمال کیا ہے یعنی خواب کا — اس میں کیا شبہ ہے کہ خواب انسان کے ذہن کو غیر معمولی طور پر متاثر کرتا ہے، وزیرن بھی ایک خواب دیکھتی ہے جس سے متنبہ ہو کر اپنے اعمال بد سے ہمیشہ کے لیے توبہ کرلیتی ہے۔ اس اعتبار سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ وزیرن کے کردار کا ارتقاء فطری اور نفسیاتی ہوا ہے۔

وزیرن کا یہ نیک انجام رشیدۃ النساء کی انسان دوستی کا ایک کھلا ہوا ثبوت ہے اور ساتھ ہی یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے معاصروں کے برعکس انسان کو اچھے اور برے کے خانوں میں تقسیم کرنے کی قائل نہیں انہیں اس حقیقت کا شعور ہے کہ انسان کی طبیعت میں بیک وقت خیر طبیعت اور شر طبیعت موجود ہوتی ہے۔ انسان خیر اور شر دونوں کا مجموعہ ہے، انسانی فطرت کا یہ عرفان رشیدۃ النساء کو اپنے عہد کے ناول نگاروں کے درمیان بہت ممتاز کر دیتا ہے۔

اصلاح النساء کے مکالموں میں ایجاز و اختصار کے بجائے غیر معمولی طوالت نظر آتی ہے، گفتگو کیا ہے اچھی خاصی تقریر ہے لیکن اس عیب کے باوجود مکالموں کا جو اصل مدعا ہے اس سے رشیدۃ النساء بیخبر نہیں چنانچہ اصلاح النساء کے مکالموں سے کردار کی سیرت و شخصیت پر بھرپور روشنی پڑتی ہے، مرد عورت، آقا غلام، بی بی باندی، اور بڑے چھوٹے کی گفتگو میں ان کی زبان اور لب و لہجہ کے اختلاف کو بہت ہی واضح طور پر پیش کیا گیا ہے، مثال کے طور پر بی وزیرن اور ایک ماما کی گفتگو کا انداز دیکھئے:۔

وزیرن:۔ خیریت تو ہے؟ تم ایسی گھبرائی ہوئی کیوں آئی ہو صاحبزادی اور بیگم صاحب تو اچھی طرح سے ہیں؟

شبراتن:۔ سرکار تو اچھی ہیں مگر صاحبزادی کو بخار آتا ہے سر میں درد بھی ہے اور قے بھی ہوئی ہے۔

یہ سن کر وزیرن دل میں بہت خوش ہوئی، منہ بنا کر پوچھا کہ صاحبزادی تو سسرال ہی میں ہوں گی۔

شبراتن:۔ اے وہ لوگ تو بے پیر لوگ ہیں، دم نکل جائے تو کچھ کرنے والے نہیں ہیں، صاحبزادی بیمار پڑیں تو کوئی تدبیر نہیں ہوئی ہیں، ڈاکٹر کی دوا شروع ہوگی، بیگم صاحب نے کہا کہ علاج مت کرو اور ہم بوا وزیرن کو بلا کر لاؤ کچھ نہیں کیجئے تو مولوی صاحب نے تعویذ ہی کیا ہے؟ آخر وہ بھی تو پڑھے لکھے ہیں۔

اے بیوی! بی بی! تعویذ نہیں آنے دیتیں۔ وزیرن! نہیں؟

شبراتن:۔ ہاں بی! آخر بڑی بڑی مشکل سے سرکار صاحبزادی کو لے آئی ہیں۔

(اصلاح النساء حصہ اول صفحہ ۵۱۰ تا ۵۱۱) (باقی آئندہ)

د۔ ب۔ اختر

رفتار

اردو ادب کے تازہ شمارے میں باقر مہدی کا ایک مضمون "جدیدیت اور ترقی پسندی کی کشمکش" کے عنوان سے شایع ہوا ہے۔ اس مضمون میں یوں تو کئی باتیں قابل بحث ہیں لیکن خاص طور پر جدید شاعری کے سلسلے میں باقر مہدی نے جو فارمولا بنایا ہے وہ محل نظر ہے ان کا کہنا ہے کہ جدید شاعری کی درسی شاعری کے خلاف تخلیق کی گئی ہے نیز درسگاہوں سے بچانے کی کوشش ہی صنعتی شہروں کی شاہراہوں اور گلیوں میں لائی ہے۔ پھر انھوں نے کلیہ سازی کو اور زیادہ تنگ دائرے میں قید کرنے کے لیے یہ شرط بھی لگادی کہ جدید شاعر بننے کی اہمیت صرف غیر محفوظ تشنہ، شکستہ دل جری سرکش جوانوں میں ہے۔ اور صفات سے تو اختلاف ممکن نہیں لیکن غیر محفوظ زندگی کی خصوصی شرط غور طلب ہے اس کے ساتھ انھوں نے عملی طور پر سرگودھا اور لاہور کے جدید شاعروں کو کتابی شاعری کرنے والا قرار دیا ہے ان کا کہنا ہے کہ "اگر ان جدید شہروں کے شاعر بڑے صنعتی شہروں میں مارے مارے پھریں تو ان کی قلعی اتر جائے"۔

جہاں تک میرا مطالعہ ہے میں یہ کہتا ہوں کہ جدیدیت میں سب سے غالب عنصر انتہا پسندانہ اور تنگ نظرانہ کلیوں کے خلاف بغاوت کا جذبہ ہے۔ ہمارے پیش رو ترقی پسندوں نے بھی شاعری اور ادب کو اسی طرح کے کلیوں میں جکڑنے کی غیر فطری کوشش کی تھی، جس کا اثر نہ صرف شاعری بلکہ ترقی پسند تحریک پر بھی اچھا نہیں ہوا۔ اس وقت تو کم از کم ایک سیاسی نظریہ ادب کا معیار سمجھا جاتا تھا اور اس سیاسی نظریے کو ماننے اور ادب میں برتنے کے لئے کسی شہر، مقام یا مخصوص قسم کی زندگی گزارنے کی شرط نہ تھی۔ اس کے باوجود سنجیدہ اور باشعور طبقے میں اسے تنگ نظری، انتہا پسندی اور ادعائیت سے تعبیر کیا گیا تھا۔ آج بھی ترقی پسندی کے نام پر ادب کو چند خانوں میں بند کرنے اور تقسیم کرنے کی جو کوششیں ہو رہی ہیں وہ مستحسن نہیں سمجھی جا سکتیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہمیں اس بات کا پورا احساس ہونا چاہیے کہ کہیں جدیدیت بھی چند فارمولوں میں قید ہو کر نہ رہ جائے۔ اور اس طرح سے تنگ نظری، ادعائیت اور انتہا پسندی نئے لباس میں پھر ادب کے ادبی معیاروں کی جگہ غیر ادبی معیاروں اور ہمہ گیر قدروں کی جگہ شخصی یا گروہ واری مصلحتوں کو نصیحت مسلط نہ کر دے۔

جدیدیت اس وقت ادب کا ایک مثبت رجحان بن چکی ہے۔ جدیدیت کی تعریف اور تفسیر میں اختلاف ہو سکتا ہے لیکن مجموعی طور پر اس بات میں کسی کو تامل نہ ہوگا کہ جدید ادب وہ ہے جو آج کے طرز فکر، احساس اور ادراک (SENSIBILITY) کے ساتھ زندگی کے انفرادی اور اجتماعی تقاضوں کی تکمیل و ترجمانی کرتا ہے۔ اس وسیع تر تعریف میں اتنی گنجائش ہے کہ ہر شاعر یا ادیب اپنے انفرادی تجربات اور طرز اظہار کے لیے موزوں اسالیب کی تلاش کرے۔ جدیدیت کسی ایک نظریے سے پوری طرح وابستگی (COMMITMENT) اختیار نہ کرتے ہوئے بھی مختلف نظریات (سیاسی، سماجی اور ادبی) کے زندہ متحرک اور صحت مند عناصر کو اپنے میں جذب کر سکتی ہے کیونکہ جدیدیت کوئی جامد یا مجرد تصور (CONCEPT) نہیں بلکہ ایک متحرک، فعال اور ارتقا پذیر عمل (PROCESS) ہے۔ اس عمل کو ہر فنکار اپنے ذاتی اور داخلی تجربوں کی روشنی میں سمجھ سکتا اور اسے فن میں برت سکتا ہے۔ کچھ لوگوں کے یہاں جدیدیت کا ایک پہلو نمایاں ہو سکتا ہے اور کچھ کے یہاں بعض دوسرے پہلوؤں پر زور ہو سکتا ہے۔ جدیدیت کے اسی وسیع تر مفہوم کو سامنے رکھا جائے تو ہم ادب کو تھیلوں، گروہوں اور خانوں میں تقسیم کرنے کی بدعت سے بچ سکتے ہیں۔ جدیدیت نہ تو صرف صنعتی شہروں میں زندگی کے بکھرنے اور غیر محفوظ ہونے سے عبارت ہے اور نہ صرف تنہائی کے احساس سے یہ محض موت یا خودکشی کے جذبے کی تسکین کا نام بھی نہیں اور جنس کے تلخ تجربات کو سنسنی خیز انداز میں پیش کرنے کا عمل بھی نہیں۔ مختلف شاعروں کے یہاں یہ عناصر کم یا زیادہ شدت کے ساتھ عنا صر موجود ہو سکتے ہیں لیکن ان میں سے کسی مثبت یا منفی رویے ہی کو کلی جدیدیت سمجھنا غلط ہوگا۔ جدیدیت داخلی تجربے اور اظہار ذات کے

ذکاءالدین شایاں

غزل

سینے میں دردِ غم کو پھر آباد ہی کرو
بھیگی ہوئی ہے رات، اسے یاد ہی کرو

اب تو سکوتِ لب سے بھی بنتا نہیں ہے کام
شاید سکوں ملے، کوئی فریاد ہی کرو

تاریکیوں کے ڈیرے ہیں کب سے خیال میں!
آنکھوں کے جگنوؤ، انھیں آباد ہی کرو

کوہِ گرانِ زیست ہے، اپنے نفس کو پھر
جو ہو سکے تو، تیشۂ فرہاد ہی کرو

خاموشیوں سے جیسے فضائیں بھی تنگ ہیں
اپنی زبان کھولو، کچھ ارشاد ہی کرو

موسم تو دل کا بدلے، کہیں پھول تو کھلیں
پابند نکہتوں کو تم آزاد ہی کرو

ساتھ حیات و کائنات کے مسائل کی آگہی کا بھی نام ہے۔ جدیدیت میں سیاسی اور سماجی شعور کے شاعرانہ اظہار کی بھی جگہ ہے بشرطیکہ یہ شعور سیاسی نعرہ نہ بنے بلکہ شعر کے نامیاتی کل کا لاینفک جزو بن جائے۔ جدیدیت اور ترقی پسندی (بشرطیکہ اس اصطلاح کے اب کوئی ادبی معنی بھی رہ گئے ہوں) میں بنیادی فرق رویے کا ہے۔ جدیدیت ادبی رویے پر زور دیتی ہے اس لئے اس کے نزدیک شعر کا اچھا ہونا بنیادی شرط ہے خیال یا نظریے کی حیثیت ثانوی ہے۔ ترقی پسندی میں فوقیت خیال یا نظریے کو دی جاتی ہے اور شاعری ضمنی شے بن جاتی ہے۔ اس رویے کے فرق کے باوجود جدیدیت اور ترقی پسندی دو متضاد یا مخالف رجحانات نہیں۔ جدیدیت اپنے وسیع تر غیر سیاسی مفہوم میں ترقی پسند بھی ہو سکتی ہے، اور ترقی پسند شاعری، اپنی نظریاتی وابستگی کے باوجود جدیدیت کی روح سے قریب بھی آ سکتی ہے۔ جن لوگوں نے ان دونوں رجحانات کو ایک دوسرے کی ضد سمجھ کر مناظرے اور مجادلے کا سلسلہ شروع کیا ہے، ان کا مقصد ادبی کم اور غیر ادبی زیادہ ہے۔ اس صورت حال میں ہم میں سے ہر ایک کا، اور بطور خاص ان شاعروں اور نقادوں کا جو اپنے کو کسی نہ کسی عنوان سے جدیدیت کے ساتھ منسلک سمجھتے ہیں، یہ فرض ہے کہ وہ جدیدیت کو محدود خانوں میں تقسیم کر کے اس رجحان پر تنگ نظری، انتہا پسندی اور ادعائیت کی چھاپ لگانے سے گریز کریں۔

اچھی شاعری کبھی کتابی نہیں ہوتی بلکہ زندگی کے براہ راست تجربے سے تخلیق پاتی ہے۔ شاعری میں کوئی نظریہ تو مل سکتا ہے لیکن نظریہ خود شاعری کے عمل میں تشکیل پاتا ہے۔ نظریہ شاعری کا نتیجہ ہوتا ہے سبب نہیں۔ البتہ جو لوگ پہلے نظریہ تراشتے ہیں اور پھر شاعری کرتے ہیں ان کے یہاں حقیقی شعری تجربے کا فقدان ہوتا ہے۔ جدید شاعری میں بھی کچھ عرصے سے یہ خرابی پیدا ہو چلی ہے کہ ہمارے بعض ساتھی ترقی پسندی سے برملا اعلان انحراف کرنے کے باوجود اپنے ادبی رویے میں نظریے یا فارمولے کو شاعری پر ترجیح دینے لگے ہیں۔ اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ شاعری محض اظہار ذات یا محض احساس تنہائی یا محض صنعتی شہروں میں فرد کے المیے سے عبارت ہے، تب بھی یہ قطعاً لازم نہیں آتا کہ ہر وہ شخص جو ان میں کسی ایک فارمولے کو شاعری کی ابتدا و انتہا مان کر میکانکی طور پر شاعری کرے، صحیح معنوں میں جدید کہلائے جانے کا مستحق ہے۔ جدیدیت اسی میکانکیت اور نظریہ سازی کے خلاف مثبت رد عمل سے شروع ہوئی ہے۔ جدید شاعری کے سلسلے میں جو بھی مسائل پیدا ہوئے، موضوعات اور طرز ادا دونوں سے، وہ اس شاعری کا فطری نتیجہ ہیں۔ لیکن ان نتائج ہی کو اصول بنا کر چلنے میں خطرے ہیں۔ اس بات کو ایک مثال سے واضح کرنا چاہتا ہوں۔ آج کل جدید شاعری کے متعلق ترسیل و ابلاغ کے مسائل خاصی اہمیت اختیار کر گئے ہیں۔ اس کے اسباب ہیں۔ ایک تو یہ کہ جدید شاعری کی زبان اور محاورہ ([illegible]) بدل رہا ہے، روایتی زبان اور پرانے الفاظ ناکافی ثابت ہو رہے ہیں اس لیے یا تو ان کے معانی کی توسیع ہو رہی ہے یا نئے الفاظ نئے مفاہیم کی ادائیگی کے لیے وضع کیے جا رہے ہیں۔ زبان کی تبدیلی کے اس عمل کے ساتھ ہی لہجے میں بھی بنیادی تبدیلی ہوئی ہے۔ اب براہ راست اور واضح قسم کی خطیبانہ صراحت کی جگہ رمزیت و اشاریت نے لے لی ہے اور شاعر خود اپنے آپ سے مخاطب ہے۔ یہ تلاش ذات کا بھی نتیجہ ہے اور اظہار ذات کا بھی۔ اس کے ساتھ اب شاعری طے شدہ نتائج کا اظہار نہیں رہی، بلکہ نظم اپنی اندرونی اور شعری منطق کے سہارے چلتی کبھی کبھی بالکل ہی غیر متوقع نتیجہ پر ختم ہوتی ہے۔ یہ تمام عناصر ایسے ہیں جن کی وجہ سے شاعری میں ابہام پیدا ہوتا ہے۔ ابہام بذات خود کبھی بھی برا نہیں سمجھا گیا بلکہ مارکس اینگلز تک شعر کے ابہام کو حسن سمجھتے رہے ہیں۔ اس لیے موجودہ شاعری سے وضاحت کا تقاضہ اور طے شدہ نتائج تک پہونچانے کی توقع رکھنا غلط ہوگا۔ تلاش کا جذبہ صادق ہونا چاہئے اب یہ تلاش جہاں بھی پہونچائے۔ اگر پہلے سے منزل اور راستوں کا تعین کر لیا جائے تو پھر تلاش کے کوئی معنی ہی نہیں باقی رہیں گے۔ یہ تو وہ صورت حال ہے جو حقیقی شاعری کو پڑھ کر سامنے آتی ہے، لیکن کچھ شاعر ایسے بھی ہیں جنہوں نے ابہام کو شعوری یا تقلیدی طور پر شعر کا حسن سمجھ کر قبول کیا اور یہ سمجھ بیٹھے کہ اچھی شاعری وہی ہے جو اتنی مبہم ہو کہ کسی کے پلے کچھ پڑے ہی نہیں۔ تقلیدی طور پر شعوری ابہام بلکہ اہمال پیدا کرنے والے جدید شاعروں کا خاصا بڑا گروہ ہے۔ ان کی شاعری کی ناکامی کا اصلی سبب یہی ہے کہ انھوں نے ایک نتیجے کو جو ضمنی طور پر سامنے آیا تھا شاعری کا منتہا مقصود اور کل سرمایہ سمجھ لیا۔ اسی طرح اگر کچھ شاعر محض تنہائی اور ذات کے المیے ہی کو کل شاعری سمجھ لیں تو پھر ذات کے اس حقیقی تجربے تک نہیں پہنچ سکتے جو کائنات کے اسرار اور زندگی کے مختلف مراحل سے گزرتا اور ذات کو آفاق سے جوڑتا ہے۔ شاعری کے سلسلے میں فارمولا بنانا ہمیشہ "ناشاعری" یا بہت ہی خراب قسم کی مصنوعی اور تقلیدی شاعری کو فروغ دینے کا سبب بنتا ہے۔ نظریے اور شعر کا تعلق اتنا مصنوعی اور میکانکی نہیں ہوتا جیسا کہ جدیدیت کے بعض انتہا پسند یا ادعا پرست شارحین نے سمجھ لیا ہے۔ جدیدیت نہ تو ابلاغ کی نفی ہے نہ شعوری یا تقلیدی ابہام پرستی نہ ہیئت پرستی ہے نہ سیاسی اور سماجی شعور کی نفی۔ جدیدیت کے مخالفین جب جدید شاعروں کو سماجی ذمہ داری کا منکر قرار دیتے ہیں یا اسے ترقی پسندی کے خلاف کوئی محاذ سمجھتے ہیں تو وہ اب بھی ادعا پرستی اور میکانکی نظریہ سازی کا ثبوت دیتے ہیں۔ پچھلے چند برسوں میں جدید شاعروں نے بعض اہم سیاسی اور سماجی مسائل پر جتنی اچھی نظمیں لکھی ہیں اتنی مستند ترقی پسند شعراء نے بھی نہیں لکھیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ جدیدیت کے طرفداروں میں اکثریت ان کی ہی ہے جو سوشلزم، سیکولرازم، جمہوریت اور انسان دوستی پر اپنی سماجی زندگی میں یقین رکھتے ہیں اور عمل بھی کرتے ہیں۔ یہ محض تنگ نظری ہے کہ بلاوجہ انھیں ڈھکیل ڈھکیل کر رجعت پرستوں کی صف میں کھڑا

کرنے کی مذموم کوشش کی جائے۔ بات صرف اتنی ہے کہ سماج کے تمام ترقی پذیر اور زندہ اقدار کو ماننے کے باوجود جدید ادیب ادب میں ان کو فارمولا بنا کر مسلط کرنے کے قائل نہیں، جدیدیت ادبی اور سماجی سطح پر ہر طرز فکر اور طرز ادا کے ہر تجربے کو مستحسن سمجھتی اور زندگی و ادب کے لیے نیک فال گردانتی ہے۔ اظہار کی آزادی اور نئے تجربوں سے گھبرانا اچھی بات نہیں۔ ادب میں اختلاف کی آزادی کا بھی ہر ادیب کو حق ملنا چاہیے۔ جہاں اس حقیقت کو جدیدیت کے مخالفین نظر انداز کر دیتے ہیں، وہیں بعض انتہا پسند جدیدیتیین بھی کسی مخصوص اور محدود نقطۂ نظر سے اختلاف کو جدیدیت سے اخراج کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اگر کوئی جدید نقاد صرف اپنے ذاتی نقطۂ نظر کو پوری جدید شاعری کی کسوٹی قرار دے دیں تو میرے نزدیک یہ جدیدیت کی بدقسمتی ہوگی شاعری میں داخلی اور شخصی تجربات کی اہمیت ہے لیکن تنقید میں ہر شخص کو زیادہ سے زیادہ معروضی انداز نظر اختیار کرنا چاہیے۔

باقر مہدی ایک اچھے شاعر اور بالغ نظر نقاد ہیں۔ ان کے مضامین ان کے مضامین میں جرات اور بے باکی کے ساتھ گہری ادبی بصیرت بھی ملتی ہے لیکن وہ اب تک اس انتہا پسندی سے پوری طرح آزاد نہیں ہو سکے جو ایک زمانے میں ادبی مسلک کے طور پر اختیار کی گئی تھی۔ ایک انتہا کو رد کر کے دوسری انتہا کو اختیار کرنا پچھلی غلطی کو دہرانا ہے۔ پچھلے دور کی محدود نظری انتہا پسندی اور ادعا پرستی کی وجہ سے ادب و تنقید میں جو خامیاں پیدا ہوئی ہیں ان سے سبق سیکھنا اور انھیں دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ یہ رجحان خواہ کسی صورت میں ابھرے، خطرناک ہے۔ صنعتی شہروں میں غیر محفوظ زندگی گزارنے والا شاعر یقیناً بعض ایسے تجربات سے گزرتا اور ان کے اظہار پر قادر ہو سکتا ہے جو دوسرے شاعروں کے یہاں اتنی شدت کے ساتھ راہ نہیں پا سکتے لیکن یہ جدید شاعری کا صرف ایک پہلو ہے، صنعتی شہر کے مسائل کو جدیدیت کی بنیاد مان لینا بھی ایک میکانکی رویہ ہے اور اس فارمولے کے تحت اس سے زیادہ میکانکی اور کتابی شاعری وجود میں آ سکتی ہے جتنی چھوٹے شہروں کے محدود تجربوں میں ممکن ہے۔ ایک طرف تو ہم یہ کہتے اور لوگوں کو یقین دلاتے ہیں کہ اب دنیا اتنی سکڑ گئی ہے کہ ہم ویت نام کے اثرات اپنے گھر میں محسوس کر سکتے اور مارٹن لوتھر کنگ کے قتل کو اپنے کسی عزیز دوست کا قتل سمجھ سکتے ہیں دوسری طرف شہروں اور علاقوں کی حد بندی کرنے کے قدامت پسندانہ رجحان پر اصرار کرتے ہیں اس وقت جبکہ زمین سے چاند اور سورج تک کے سفر کی منزلیں آسان ہو رہی ہیں تخلیقی تجربے کو کسی ایک شہر یا چند شہروں تک محدود سمجھنا تخلیقی عمل کی آفاق گیری سے انکار کرنا ہے۔ یہ تو ہر شاعر کے اپنے VISION، ذہنی افق، اور تجربات کے تنوع پر منحصر ہے کہ وہ زندگی کے کتنے رنگوں اور پہلوؤں کو سمیٹتا اور اپنی ذات کو کس حد تک آفاق کا آئینہ بنا سکتا ہے اس کے لیے بڑے شہر یا چھوٹے شہر، محفوظ یا غیر محفوظ زندگی کا سوال اتنا اہم نہیں جتنا تخلیقی صلاحیت اور وسعت نظر کے ساتھ احساس کی شدت کا سوال ہے۔ پھر یہ سوال بھی اہم ہے کہ محفوظ اور غیر محفوظ سے کوئی شخص کیا مراد لیتا ہے۔ اس کی بھی مختلف سطحیں اور مدارج ہیں جب پورا معاشرہ ہی شکست و ریخت، مصلحت اندیشی، ریاکاری اور معاشی تنگ و دو میں ہر اصول کو توڑنے کے عمل سے دوچار ہے تو کوئی حساس ایماندار، خوددار، اور اصول پرست اور چند اقدار پر یقین رکھنے والا کبھی بھی اپنے کو ذہنی اور نفسیاتی طور پر محفوظ نہیں سمجھ سکتا۔ جس چیز کو باقر مہدی غیر محفوظ زندگی گزارنا کہتے ہیں وہ بعض صورتوں میں زندگی کی ذمہ داریوں سے گریز کی بھی ایک شکل ہو سکتی ہے۔ زندگی کا تجربہ زندگی کو ہر سطح پر برتنے اور گزارنے میں مضمر ہے نہ کہ زندگی کے ایک رخ کو اختیار کر لینے میں۔ میں باقر مہدی کے THESIS سے زیادہ بحث اس لیے غیر ضروری سمجھتا ہوں کہ اس سے شاید ہی کوئی پوری طرح اتفاق کرے گا۔ اصل اہمیت اس طرز فکر اور رجحان کی ہے جو جدیدیت کو اتنا محدود کرنے پر مصر ہے کہ چند "اصحاب معتبرین" کے علاوہ باقی سب شاعر "اصحاب یمین" دیار بنا کر جدید شاعری کے دائرے سے باہر کر دیے جائیں۔ ہمیں تو جدیدیت کی ایسی تعریف کرنی چاہیے جو زیادہ سے زیادہ اچھے اور تخلیقی طور پر زندہ شاعروں کو اپنے دائرے میں لے سکے۔ شاعری کے کتابی یا تخلیقی اچھے یا برے ہونے کا فیصلہ کسی فارمولے یا کلیے سے نہ ہو سکتا ہے نہ ہوگا شاعری کا حقیقی معیار خود شاعری ہے۔ اچھی شاعری تمام فارمولوں سے آزاد اور بالاتر ہوتی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جو جدیدیت کے صحیح تصور نے ہم پر منکشف کی ہے۔ اگر اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا جائے تو خود تنقید بھی کتابی ہو جاتی ہے۔ میں آخر میں جارج سٹینر (GEORGE STEINER) کا وہی قول دہراؤں گا جو خود باقر مہدی نے اپنے نظریے کی تائید میں درج کیا ہے۔

"NOTHING IS MORE ACADEMIC THAN MODERNISM MADE RIGID"

"جدیدیت کو کٹر بنا دیا جائے (باقر مہدی کے الفاظ میں سرد بنا دینے) سے زیادہ مدرسانہ عمل اور کوئی نہیں"

یہ قول جدیدیت کو کٹر اور محدود بننے کے خطروں ہی کی طرف توجہ دلا رہا ہے کیونکہ فارمولے بنانا خود مدرسی اور کتابی عمل ہے۔

انیس اور

مکتوب لندن

اردو میں اعلانات

گزشتہ ہفتہ بی بی سی ریڈیو کی تاریخ میں پہلی مرتبہ انگریزی خبریں سناتے ہوئے ایک اعلان اردو میں نشر کیا گیا۔ یہ اعلان اس ایشیائی خاتون سے متعلق تھا جس کے جسم کا کچھ حصہ دو سوٹ کیسوں میں ملا ہے۔ چونکہ وہ خاتون ایشیائی تھی اور اس کا تعلق بھارت یا پاکستان سے تھا اس لئے پولیس کی خصوصی ہدایت پر بی بی سی نے ریڈیو پر یہ اعلان اردو میں نشر کیا۔

یہی اعلان سلیم شاہد نے ٹیلیویژن کے پروگرام میں بھی نشر کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انگریزی خبروں کے مقابلہ میں ایشیائی گھرانے زیادہ تر بھارتی اور پاکستانی سنتے ہیں۔

اپنے بچوں کو اردو ضرور سکھایئے

رشیدہ قریشی بریڈ فورڈ سے اطلاع دیتی ہیں کہ مقامی بچوں کی سہولت کے لیے ۱۰ اپریل کی فرصت سے ہر سنیچر کو ۲ تا ۴ بجے سہ پہر آل سینٹ اسکول ایکلین روڈ میں اردو کی جماعتیں باقاعدہ شروع کردی گئی ہیں تاکہ ہندوستانی بچے اپنی مادری زبان سے مانوس ہو کر اپنی انفرادیت قائم رکھ سکیں اور جب وہ وطن لوٹیں تو انھیں اردو سے لاعلمی کے باعث اجنبیت کا احساس نہ ہو۔ بریڈ فورڈ میں تقریباً ۹ ہزار اردو داں آباد ہیں مگر ابھی تک صرف ۳۰ بچے اس سہولت سے استفادہ کر رہے ہیں لہٰذا انھوں نے مقامی ماؤں سے درخواست کی ہے کہ وہ اپنے بچوں کو اس مرکز میں ضرور بھیجیں۔

سالنامہ آفاق

اس مہینے "آفاق" کا سالنامہ منظرِ عام پر آیا ہے جو عام شماروں سے زیادہ ضخیم اور علمی مواد و مضامین زیادہ معیاری و جاذبِ نظر ہے۔ قلمکاروں میں سعادت حسن منٹو (مرحوم)، جمیل شعاقی، احمد ندیم قاسمی، تنویر نقوی، رام لعل، علامہ اقبال (غیر مطبوعہ کلام)، ریاض خیرآبادی (مرحوم)، اے۔ حمید کے علاوہ انگلستان سے سلیم شاہد، شریف بقا، میر بشیر، عطا جالندھری، پروفیسر خالد بیزمی، مومن شکور عاجز، مامون ایمن وغیرہم شامل اشاعت ہیں۔

انتخاب: سلیم شاہد

پھر جیسے کہ ماجرے پہ وہ سرگذشت
تھا کوئی بے مزہ سا کہانی کا ذائقہ
شاید تمام اس کی زباں پہ لفظوں کی سیڑھیاں
شاید تمام رنگ رونق پہ طاری تھا تیرگی
نسیل شعاعی۔

حیران ہوں کہ ذہن سے کیا کیا اتر گیا
وہ کون تھا جو دشت میں پیاسا اتر گیا
کاغذ پہ ہر جو وہ سراپا اتر گیا
پانی تھے جہاں نظر آیا اتر گیا

نہ ہوس مجھے مئے ناب کی نہ طلب صبا و سحاب کی
تری چشم ناز کی خیر ہو مجھے بے پیئے ہی سرور ہے

تنویر نقوی

ہمارے واسطے ہر آرزو کانٹوں کی مالا ہے
ہمیں تو زندگی دے کر خدا نے مار ڈالا ہے

احمد ظفر

آسماں کی آنکھ سورج چاند بینائی بھی ہے
روشنی میرے لیے کیوں وجہ رسوائی بھی ہے
زہر آلودہ فضا میں جب کلی سونے لگی
اشک شبنم نے کیا گلشن میں پروائی بھی ہے

شاگرد ضیا فوزی

اور جانے بے کار سے لگے افکار گہ ہستی کو بدل
چکنا چور ہوئے جاتے ہیں میرے ذہن کے شیش محل
مغرب کی تہذیب کا شاگرد ہم نے پہچان لیا
سونے کی مانند چمکتا ہے لیکن اس میں ہے پیتل

مامون ایمن

سنتے سنتے تھک گئے ہم زندگی کا ماجرا
ایک عنواں، ایک مضموں، ایک ہی افسانہ تھا

ڈاکٹر ایمان اخلاقی

یوں لرزتا ہے امید دل کا دیا آخر شب
صبح دم جیسے افق پر ہو ستارہ لرزاں!
سرخی شام دگر رقص کناں ہو ایسا
کاش ان کے لب لعلیں ہوں بادہ لرزاں!

نذیر احمد گردیزی

شکسپیر یا شیخ زبیر

عراق کے نوجوان اسکالر یعقوبی نے تین سال کی عرق ریز اور شب خیز تحقیق کے بعد دعویٰ کیا ہے کہ شکسپیر مسلمان تھا۔

ڈاکٹر یعقوبی سوال کرتا ہے کہ دیسٹ منسٹر ایبے میں شکسپیر کی قبر سب سے علیحدہ کیوں ہے اور اس کا کتبہ صلیبی کے بجائے ہلالی کیوں ہے؟ اور یہ واحد قبر ہے جس کا رخ مغرب کی طرف ہے۔ شکسپیر کے مکان میں محرابیں ہیں۔ یعقوبی نے الزبتھ کے دور میں اسپین کے سفیر کا وہ مراسلہ تلاش کیا ہے جس میں شیخ زبیر کو سفیر مقرر کیا گیا تھا۔ ان کی عربی نظمیں اور آٹھ عربی ڈرامے بھی یعقوبی نے دریافت کئے اور مارلو کا وہ خط بھی جو اس نے شیخ زبیر کو لکھا تھا کہ کاش آپ اپنے عربی ذخائر کو انگریزی میں منتقل کر دیں۔ مرچنٹ آف وینس "مسود ابو عرب" کا بالکل ترجمہ ہے۔ اوتھیلو کا اصلی نام عطا اللہ تھا اور وہ مور تھا۔ شکسپیر اور شیخ زبیر لاولد تھے۔ دونوں کی وصیت تھی کہ لائبریری ساتھ دفن ہو۔ شکسپیر کی تصویر میں کان چھیدے ہوئے ہیں۔ شیخ زبیر انگلستان سے کہیں واپس نہیں گئے۔ شکسپیر کی قبر پر صلیبی نشان موت کے چار سال بعد لگایا گیا تھا۔

۔۔۔۔۔×۔۔۔۔۔

محمد اسلم

جاسوسی ادب

جاسوسی ادب کے بارے میں عام طور پر کئی رائیں پائی جاتی ہیں کوئی اسے "ناسور" کہتا ہے اور کوئی "ادب کی روح" قرار دیتا ہے۔ اس کے مخالفوں میں ایک تکرار سی رہتی ہے۔ ہر کوئی اپنے نظریہ کی تائید میں مثالیں بہم پہنچاتا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اس کے خیالات زیادہ بافہم اور صحیح ہیں۔ اور ان ہی جھگڑوں میں جاسوسی ادب "بیچارگی" کا شکار ہو گیا ہے۔

اس کی کسمپرسی سے چند ابن الوقت خوب فائدہ اٹھا رہے ہیں اور تفریح کے نام پر سیدھے سادے عوام کو بیوقوف بنا رہے ہیں۔ چونکہ وہ سطحی باتوں سے پر ہوتا ہے اور اس کے اندر غیر ادبی شہ پاروں کا ایک وافر خزانہ پوشیدہ ہوتا ہے لہذا ان کے اثرات ذوق عامہ پر کافی اثر انداز ہوتے ہیں اور ان کو ادبی چیزیں خشک معلوم ہونے لگتی ہیں کیونکہ انہیں سمجھنے کے لیے کافی گہرائی میں جانا پڑتا ہے۔ رفتہ رفتہ ان کا ذہن گہرائی میں جانے سے گھبرانے لگتا ہے اور سطحی باتوں کی طرف راغب ہونے لگتا ہے اور اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ جاسوسی ادب بھی ایک زہریلی سوئی ثابت ہو رہا ہے، وہ زہریلی سوئی جو آہستہ آہستہ لوگوں کے اندر سرایت کر جاتی ہے، "اتنی آہستگی سے کہ انہیں احساس تک نہیں ہوتا" اور یہ قدردان ادب کے لیے نیک فال نہیں۔ اگر ابھی اس کے زہریلے دانت نہیں توڑ دیے گئے تو مستقبل قریب میں بیحد مضر ثابت ہوگا اس کا تصور ممکن نہیں۔ اور اگر ابھی اس کی اصلاح کر دی گئی تو یہ ایسا جواہر ثابت ہوگا جو ادب کو واقعی ایک ایسی روشنی سے سرفراز کرے گا کہ رہتی دنیا تک لوگ جاسوسی ادب کی اور اصلاح کنندہ کی یاد کو اپنے دل میں تازہ رکھیں گے کیونکہ سانپ بذات خود برا نہیں ہوتا اس کے زہریلے دانت مضر رساں ہوتے ہیں۔

بہت سی خامیوں کے باوجود بھی جاسوسی ادب میں لاتعداد خوبیاں موجود ہیں، جن سے انکار ممکن نہیں مثلاً اس نے زبان اردو کو نیا اسلوب بیان دیا ہے جس میں سلاست ہے، روانی ہے، دلکش انداز بیان ہے اور ایک ایسا طرز بیان بھی ہے جس میں خوبصورتی و دلکشی کا عنصر بدرجہ اتم موجود ہے۔ اس کی زبان آسان اور سہل الفہم ہے، اتنی آسان کہ معمولی پڑھا لکھا بھی اس کی تحریر کو بخوبی پڑھ لیتا اور سمجھ لیتا ہے اور کماحقہ اس مفہوم سے آگاہ ہو جاتا ہے اور یہی وہ سب سے بڑی خصوصیت ہے جو جاسوسی ادب کو (باوجود ادبی نقدان کے) عوام میں قبول عام کا درجہ دیتا ہے اور روز افزوں اس کی مقبولیت میں اضافہ کا سبب بنتا ہے اس کے علاوہ بھی اس میں بہت سی خوبیاں ہیں۔ جنھیں اجاگر کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ ہیرا بھی پہلے پتھر ہی ہوتا ہے مگر جب اس کے گرد صاف ہوتے ہیں تو جوہری کی جوہر شناس نگاہیں اس کو اس کے صحیح مقام پر پہنچا دیتی ہیں۔

نقادان فن جو خود کو ادب کا پجاری کہتے ہیں، اب ان پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنے بوسیدہ لبادوں سے باہر نکل آئیں اور پرانی قدروں کے ساتھ نئی قدروں کی بھی ہمت افزائی کریں۔ اور اس طرف توجہ خاص کریں۔ کیونکہ پرانے تذکروں کی مدد سے تنقید کرنا کوئی بڑی بات نہیں، لطف تو جب ہے کہ ابھرتی ہوئی نئی چیزوں پر توجہ فرمائیں اور اس کی خوبیوں اور خامیوں کو واضح انداز میں اس طرح عوام کے سامنے کر دیں کہ وہ اس کے اچھے اور برے اثرات سے کماحقہ آگاہ ہو جائیں اور نادانستگی میں غلطیوں کا شکار ہونے سے بچ جائیں۔

آج جاسوسی ادب بھی ناقدان فن کی توجہ چاہتا ہے اور وہ اس بات کا متمنی ہے کہ نقاد صاحبان اس کے مقدمے پر ضروری غور و خوض کریں اور اس پر جو "ناسور" کا الزام لگایا جا رہا ہے اور وہ دھبہ جو روز بروز بڑھتا ہی جا رہا ہے اس کو دھونے کی طرف توجہ فرمائیں۔ کیا ناقد سے ایسی مانگ ناجائز ہے؟ اگر جائز ہے تو اب تک بے توجہی کیوں برتی گئی؟ کیا نقاد صاحبان اس کا جواب دیں گے کہ اس تساہل عارفانہ کی کیا وجہ تھی؟ کیا وہ اپنی پرانی بے توجہی کا ازالہ کریں گے؟

ناقد ایک جوہری ہوتا ہے جو فن کی پرکھ جانتا ہے اور وہ کسی چیز پر پڑے ہوئے گرد و غبار کو صاف کرتا ہے اور اس کی اصلیت کی تہ تک پہنچتا ہے اور جب اس کی تہ تک رسائی ہو جاتی ہے تب اس کو اپنی کسوٹی پر کستا ہے اور دوسروں کو اس کی خوبیوں اور خامیوں کے مقدار سے آگاہ کرتا اور خامیوں کو زیادہ سے زیادہ واضح انداز میں سامنے لاتا ہے تاکہ لوگ اس کی خامیوں کو دیکھ لیں اور اس سے بچنے کی تدبیر کریں۔

اگر ہمارے نقادان فن نے جاسوسی ادب کی طرف توجہ دی تو اس کی بھی خوبیاں اور خامیاں الگ الگ ہو جائیں گی جیسے دودھ اور پانی۔ اس طرح عوام اس کی اصلیت سے آگاہ ہو جائیں گے اور جب عوام کی آنکھیں کھل جائیں گی تو وہ لوگ بھی اپنی روش میں تبدیلی لانے پر مجبور ہوں گے جنھوں نے عوام کو بیوقوف بنا کر اپنی تجوری کو بھرنا اپنا مسلک بنا لیا ہے اس کے علاوہ ہمارے وہ کہنہ مشق ادبا بھی سنبھل جائیں گے جو چاندی کے "کھنکتے" ہوئے چند سکوں کے عوض اپنی صلاحیت کو بیکار باتوں میں برباد کر رہے ہیں اور اس طرح ان کے اندر بھی علم کے دریچے کھل جائیں گے اور وہ اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے صاف ستھرے ادب کو پیش کرنے کی بھرپور سعی فرمائیں گے اور اس طرح یہ ادب جو "ناسور" بن گیا ہے واقعی "ادب کی روح" کہا جائے گا۔

(ایم۔ اے قمر کلکتہ)

انجمن ترقی اردو مغربی بنگال کے وفد کی لسانی اقلیتی کمشنر کو میمورنڈم

انجمن ترقی اردو مغربی بنگال کا ایک وفد جناب محمد یوسف فیروزی صاحب سابق الڈرمین کلکتہ کارپوریشن کی سرکردگی میں لسانی اقلیت کے اسسٹنٹ کمشنر جناب باجپائی سے رائٹرس بلڈنگ میں ملا۔ وفد کے دیگر اراکین انجمن کے جنرل سکریٹری جناب ایم اے مجیب، جناب احمد اللہ انصاری برقی اور پروفیسر اعزاز افضل تھے۔ سب سے پہلے انجمن کے جنرل سکریٹری نے ایک میمورنڈم پیش کیا جس میں اردو کے ساتھ سارے ہندوستان میں ناانصافیوں کا تذکرہ کرنے کے بعد مغربی بنگال کی اردو بولنے والی آبادی کی جانب سے بارہ واضح مطالبات درج تھے۔ اسسٹنٹ کمشنر موصوف نیز دیگر افسران نے میمورنڈم کو پڑھا اور اس کے بعد گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا۔ گفتگو سب سے پہلے انجمن کے اس مطالبہ پر شروع ہوئی کہ پبلسٹی ڈپارٹمنٹ کی جانب سے اردو کا پندرہ روزہ رسالہ "مغربی بنگال" جس کی اشاعت یکم اپریل سے بند کردی گئی ہے اسے جاری رکھا جائے۔ ڈائرکٹر آف انفارمیشن نے بتایا کہ چونکہ "مغربی بنگال" کے صرف پانچ خریدار تھے اور اس وجہ سے آڈٹ کو اس رسالہ کے جاری رکھنے پر اعتراض تھا اس لئے مجبوراً اس کی اشاعت بند کرنا پڑی۔ لیکن حکومت کا یہ خیال ہے کہ اس کی تلافی اردو میں پوسٹر اور پمفلٹ وغیرہ وقتاً فوقتاً نکال کر کی جائے۔ وفد کی طرف سے یہ بات پیش کی گئی کہ اگر گورنمنٹ چاہتی تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ کلکتہ میں اس رسالہ کے کافی خریدار نہیں ہو جاتے۔ ساتھ ہی اس بات کی بھی ضرورت تھی کہ اس کے معیار کی طرف دھیان دیا جاتا۔ ایک سوال کے جواب میں ڈائرکٹر موصوف نے بتایا کہ نیپالی کا جو ہفتہ وار اخبار نکلتا ہے اس کے کل خریدار ۲۰۰ ہیں۔ انجمن نے یہ پیش کش کی کہ اگر گورنمنٹ چاہے تو "مغربی بنگال" کے ایک سو خریدار مہیا کئے جا سکتے ہیں جو نیپالی اخبار کے تناسب سے زیادہ ہی ہوگا۔ وفد نے اس سلسلہ میں دیگر طریقوں سے بھی تعاون کا یقین دلایا۔ افسران اس پیش کش سے بہت متاثر ہوئے اور وعدہ کیا کہ وہ اسے اپنے افسران بالا کے سامنے پیش کریں گے۔

انجمن کی اس شکایت پر کہ جن ملازمتوں کے لئے بنگلہ جاننا ضروری نہیں ہوتا ہے اس کے لیے بھی بنگلہ جاننے پر اصرار کیا جاتا ہے اس سلسلہ میں حال میں اردو لکچرار اور کلکتہ مدرسہ کے اسسٹنٹ ہیڈ ماسٹر کی اسامیوں کو پُر کرنے کے سلسلہ میں بنگلہ جاننے پر اصرار کا تذکرہ کیا گیا۔ اسسٹنٹ کمشنر صاحب نے خیال ظاہر کیا کہ یہ عمل مناسب نہیں اور انھوں نے فرمایا کہ اشتہارات کی نقل ان کو مہیا کی جائے تاکہ وہ ضروری اقدام کریں۔

ایک مطالبہ یہ تھا کہ لیڈی برابورن کالج اور ہوگلی محسن کالج میں اردو آنرز اور پریذیڈنسی کالج اور دارجلنگ گورنمنٹ کالج میں اردو پاس کی تعلیم کا انتظام کیا جائے اور ان کالجوں کے علاوہ دیگر جن جن کالجوں میں اس کا مطالبہ کیا جائے اس پر فوری اقدام کیا جائے۔ افسران اور اسسٹنٹ کمشنر صاحب نے وعدہ فرمایا کہ اس سلسلہ میں ضروری اقدامات کئے جائیں گے۔ وفد نے یہ بتاتے ہوئے کہ ریاست میں ایسے اسکولوں کی تعداد بہت کم ہے جہاں اردو ذریعہ تعلیم ہو لیکن اس پر بھی یہ شکایتیں موصول ہو رہی ہیں کہ بعض اسکولوں میں اردو کی تعلیم موقوف کردی گئی ہے یا بند کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ اس سلسلہ میں ہندو ودیالیہ انڈال اور ایسٹرن ریلوے ہائر سکنڈری ملٹی پرپز اسکول آسنسول کے نام پیش کئے گئے۔ چیف انسپکٹر صاحب نے یہ بتایا کہ انھوں نے ڈسٹرکٹ انسپکٹر بردوان کے نام ہدایت جاری کی ہے کہ وہ ہندو ودیالیہ کے بارے میں رپورٹ پیش کریں۔ رپورٹ ملنے پر ضروری اقدام کئے جائیں گے۔ ایسٹرن ریلوے اسکول کے متعلق اسسٹنٹ کمشنر صاحب نے فرمایا کہ وہ ریلوے بورڈ کے ساتھ اس سلسلہ میں گفتگو کریں گے۔ سخاوت میموریل گرلس ہائی اسکول میں اردو داں طالبات کے داخلے کے سلسلے میں دشواریوں کا جواب دیتے ہوئے اسسٹنٹ کمشنر صاحب نے فرمایا کہ ضروری تفصیلات مہیا کی جائیں تاکہ اس سلسلہ میں ضروری اقدام کر سکیں۔ وفد کے اس مطالبہ پر کہ ٹیچرس ٹریننگ کالجوں اور کارپوریشن ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ میں اردو میتھڈ سبجیکٹ کی حیثیت سے پڑھائی جائے چیف انسپکٹر صاحب نے وعدہ فرمایا کہ کم از کم ایک دو کالجوں میں اس کا انتظام کیا جائے گا۔

اس مطالبہ کے متعلق کہ ہائر سکنڈری امتحان کی طرح پری یونیورسٹی امتحان میں بھی طلبہ کو اردو میں جواب لکھنے کی اجازت دی جائے اسسٹنٹ کمشنر صاحب نے فرمایا کہ یہ مطالبہ جائز نظر آتا ہے اور وہ اس سلسلہ میں یونیورسٹی کے ذمہ داران کے ساتھ گفت و شنید کریں گے۔

وفد نے اپنے اس مطالبہ کا اعادہ کیا کہ ریاست کے ان مقامات میں جہاں اردو بولنے والوں کی معقول تعداد ہو اردو کو ثانوی سرکاری زبان قرار دیا جائے۔ اس سلسلہ میں آنجہانی ڈاکٹر رائے اور سابق چیف منسٹر جناب پی سی سین کے وعدوں کا تذکرہ کیا۔ اسسٹنٹ کمشنر صاحب نے فرمایا کہ مرکزی حکومت کے قوانین کے مطابق صرف ان مقامات پر کسی اقلیتی زبان کو ثانوی سرکاری زبان تسلیم کیا جا سکتا ہے جہاں کسی ضلع میں کم سے کم ۶۰ فیصدی لوگ اس زبان کو بولنے والے ہوں۔ البتہ کسی زبان کے ۱۵ فیصدی بولنے والے لوگ کسی تحصیل یا سب ڈویژن میں ہوں تو کسی زبان میں سرکاری اعلانات وغیرہ شائع کئے جائیں گے۔ انفارمیشن ڈائرکٹر صاحب نے بتایا کہ اسلام پور، گارڈن ریچ، [illegible]، آسنسول وغیرہ کے علاقوں میں جہاں ۱۵ فیصدی سے زیادہ اردو بولنے والوں کی تعداد بتائی گئی ہے متعلقہ حکام کو اس کی ہدایت دے دی گئی ہے۔ وفد نے اس بات پر

زور دیا کہ فقط ہدایت جاری کرنا کافی نہیں بلکہ ضرورت ہے کہ نگرانی کی جائے کہ ان ہدایتوں پر عمل ہو بھی رہا ہے یا نہیں۔ اسسٹنٹ کمشنر صاحب نے اس سے اتفاق کیا۔

اس مطالبہ کے جواب میں کہ گورنمنٹ کالجوں میں اردو داں طلبہ کا داخلہ نہیں ہو پاتا اگر وہ غیر اردو داں طلبہ کے مقابلہ میں کم نمبر یافتہ ہوتے ہیں۔ لیکن دوسرے کالجوں میں اردو کا انتظام نہ ہونے کی وجہ سے ایسے طلبہ اعلیٰ تعلیم سے محروم رہ جاتے ہیں ڈائرکٹر انفارمیشن نے کہا کہ ایسا کرنا ممکن نہیں ہوگا اس لیے کہ قانونی طور پر غیر اردو داں طلبہ معترض ہوں گے انھوں نے کہا کہ اس دشواری کا حل یہ ہے کہ اردو والے خود اپنا کالج قائم کریں۔ گورنمنٹ یقیناً اس سلسلہ میں مدد کرے گی۔ وفد نے بتایا کہ اگر شام کے کالج کھولنے کی اجازت دی جائے تو ہم ایسا کرنے پر فوراً تیار ہیں۔ اسسٹنٹ کمشنر صاحب نے فرمایا کہ اگر انھیں اس سلسلہ میں تفصیلات مہیا کی جائیں تو وہ کوشش کریں گے۔

اردو کو غیر اردو داں طلبہ کے لیے تیسری زبان کی حیثیت سے ثانوی اسکولوں میں پڑھانے کی اجازت دینے کے سوال پر چیف انسپکٹر اور دیگر افسران نے مجبوری ظاہر کی کہ اس طرح دوسری زبانوں والوں کے لیے بھی انتظام کرنا پڑے گا۔ وفد بہر حال اس پر اصرار کرتا رہا کہ ایسا کرنا ممکن نہیں۔ کلکتہ اور بیرون کلکتہ میں مزید پرائمری اسکولوں کے کھولنے کے مسئلہ پر کمیشن نے یقین دلایا کہ نئے پرائمری اسکول کھولتے وقت اس مطالبہ پر عمل کیا جائے گا۔ آل انڈیا ریڈیو کلکتہ اسٹیشن سے اردو پروگرام نشر کرنے کے متعلق اسسٹنٹ کمشنر صاحب نے فرمایا کہ وہ متعلقہ حکام کو لکھیں گے

بہار اور یوپی میں اردو کو ثانوی سرکاری اور علاقائی زبان قرار دینے سے متعلق اسسٹنٹ کمشنر صاحب نے فرمایا کہ یہ مطالبہ چونکہ دوسرے صوبے کا ہے اس لئے یا تو وہ صوبے خود اسے پیش کریں یا آپ کی مرکزی انجمن۔ وفد نے بتایا کہ یہ کل ہند مسئلہ ہے اور ہندوستان ایک اکائی ہے۔ اسسٹنٹ کمشنر صاحب نے بہر حال اس پر تبصرہ کرنے سے معذوری ظاہر کی اجلاس منٹ پر یہ گفتگو ختم ہوئی۔ (اقبال اکرامی جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو مغربی بنگال)

انجمن ترقی اردو شاخ گرمٹکال کا جلسہ

انجمن ترقی اردو شاخ گرمٹکال ضلع گلبرگہ کا سالانہ جلسہ زیر صدارت الحاج محمد حسن صاحب اختر صدر انجمن ۲۶ مارچ ۱۹۷۷ء کو اردو اسکول موہن پورہ میں منعقد ہوا۔ انجمن کی سالانہ رپورٹ جناب محمد علی جکلی معتمد انجمن نے سنائی۔ جلسہ عام سے شاخ کے ضمنی قواعد کی توثیق حاصل کی گئی۔ آئندہ سال برائے (۱۹۷۸ء تا ۱۹۷۹ء) کا موزانہ پیش کرکے توثیق حاصل کی گئی۔ موجودہ عہدیداروں کی مدت میں مزید ایک سال کی توسیع کی گئی۔ جلسہ عام میں انجمن کے پروگرام وپالیسی کی تشکیل پر غور کیا گیا اور خواتین کے لیے شبینہ مدارس اور اردو داں طلبہ کے لیے کنڑی جماعتوں کے آغاز اور دارالمطالعہ عام کے قیام کا فیصلہ کیا گیا اور سالانہ حسابات پیش کیے گئے ۲ مارچ کے منعقدہ تحریری مقابلوں کے انعامات کی تقسیم مہمان خصوصی جناب جی۔ ایم۔ گپتا۔ پوسٹ ماسٹر کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ انعام اول منیر احمد متعلم دہم، انعام دوم عبد القیوم متعلم دہم نے حاصل کئے۔ جناب محب کوثر کی جانب سے ایک اور ترغیبی انعام محمد یونس متعلم نہم کو دیا گیا۔

اس شب انجمن کے زیر اہتمام ایک غیر طرحی مشاعرہ زیر صدارت حضرت عیاں حیدرآبادی منعقد ہوا۔ اناؤنسر کے فرائض جناب محب کوثر نے انجام دئے۔ مقامی شعراء جناب محمد حسین نیتر، اسماعیل نسیم، الحاج محمد حسن اختر اور محسن نظامی کے علاوہ آر۔ ملیا نے کنڑی اور ہری شنکر گپتا نے ہندی میں اپنا کلام سنایا۔ مہمان شعراء پنڈت راگھویندر اچاری نے تلگو میں اور یوین بھارتی نے ہندی اور کنڑی میں اپنی نظمیں سنائیں۔ جواں سال مہمان شعراء جناب عثمان رہبر، جناب صابر یادگیری، جناب اعظم عاشق، جناب شمیم سرمست، جناب حافظ کبیر، جناب محب کوثر کے علاوہ کنڑ شعراء جناب بالا پرشاد گوڑ، حضرت عیاں حیدرآبادی اور دکھنی زبان کے ممتاز شاعر جناب سلیمان خطیب نے اپنا منتخب کلام سنایا۔ جناب محب کوثر کے شکریہ پر اس کامیاب ہمہ لسانی مشاعرہ کا اختتام ڈھائی بجے عمل میں آیا۔

(محب کوثر نائب معتمد انجمن ترقی اردو شاخ گرمٹکال)

تبصرے

ڈاکٹر وحید اختر

شاہکارِ وحید

مرتب: شبیب علی جین

قیمت: ایک روپیہ پچاس پیسے

ناشر: گہرستان، ادریہ جون پور

میر وحید ان مرثیہ گو اساتذہ میں سے ہیں جنھوں نے انیس کے بعد اس صنف کو زندہ رکھنے اور آگے بڑھانے میں قابلِ قدر خدمت انجام دی ہے۔ وہ میر انس کے بیٹے اور میر انیس کے بھتیجے تھے۔ زبان اور فن میں اس خانوادے کی روایات پر کاربند رہے اور مرثیہ میں بعض نئے عناصر کے اضافے کے ساتھ انیس کے رنگ کو فروغ دیتے رہے۔ مرثیے زیادہ دفانہ کی در نظر تیر کران سے اور زیادہ فیض پہونچا۔ ان کے مشہور مراثی انیس کے بہترین مرثیوں کی یاد دلاتے ہیں۔ شبیب علی جین نے بڑی تدقیق اور کاوش سے میر وحید کا طویل ترین مرثیہ مرتب کیا ہے" ریحان غم" میں اس مرثیے کے صرف ۱۵۹ بند ملتے ہیں اور دوسری جگہ ایک دوسرے مرثیے کے ساتھ ۹۰ بند۔ مجذوب لکھنوی نے مختار وحید میں ۱۸۹ بند شائع کئے ہیں۔ لیکن یہ مرثیہ اصل میں ۲۳۲ بندوں پر مشتمل ہے۔ مرتب نے یہ تمام بند پوری صحت اور تحقیق کے ساتھ جمع کرکے شائع کئے ہیں۔ اس مرثیے کو یہ فوقیت حاصل ہے کہ یہ اردو کا سب سے طویل مرثیہ ہے لیکن اپنی طوالت کے باوجود شروع سے آخر تک فن کے تمام عناصر کا مناسب ترین امتزاج پیش کرتا ہے۔ یہ مرثیہ عون و محمد کے حال میں ہے جو جناب زینب کے بیٹے اور امام حسین علیہ السلام کے بھانجے تھے۔ وحید نے بچوں کی نفسیات، جوشِ شجاعت اور سعادت کا جس خوبی سے ذکر کیا ہے وہ اس سے پہلے کسی مرثیے میں اس طرح پیش نہ کی گئی تھی۔ عون و محمد کے حال میں اور مرثیہ گویوں نے بھی لکھا ہے خود انیس کے کئی بہترین مرثیے ان شاہزادوں کے باب میں ہیں۔ میر وحید نے سب سے الگ ہٹ کر اپنا رنگ اور راستہ نکالا ہے۔ میر وحید کے یہاں لکھنوی زبان اور صنعتوں کو برتنے کا التزام انیس سے کہیں زیادہ ہے۔ انیس ان صنعتوں پر قدرت رکھنے کے باوجود ان سے بلند رہے تھے اور یہی ان کی عظمت کا ثبوت ہے کہ وہ اپنے زمانے کے عام رنگِ سخن کے تکلف و تصنع کے شکار نہیں ہوئے۔ وحید کے یہاں یہ عنصر غالب ہے لیکن اس سے ان کے مرثیے کی خوبی میں فرق نہیں آتا۔

اس تحقیقی کاوش کے لیے مرتب کی ستائش کرنا حق ناشناسی ہوگی۔

اگر اس طرح ہمارے کلاسیکی سرمایے کے دوسرے اوزان پریشان بھی مرتب کردئے جائیں اور اس طرح محفوظ ہو جائیں تو یہ ادب کی بڑی خدمت ہوگی۔ کلاسیکی شاعری سے بالعموم اور مرثیے سے بالخصوص دلچسپی رکھنے والوں کے لیے شاہکار وحید ایک خوبصورت تحفہ ہے۔

رگِ ساز

شاہین غازی پوری

ناشر: پاک کتاب گھر، ڈھاکہ، مشرقی پاکستان

قیمت: پانچ روپے

شاہین غازی پوری اردو کے نوجوان، خوش گو اور خوش فکر شاعر ہیں۔ ان کا کلام ایک مدت سے ہند و پاک کے معیاری رسائل میں شائع ہو رہا ہے۔ رگِ ساز ان کا پہلا مجموعۂ کلام ہے جس میں ۵۵ نظمیں ۴۴ غزلیں اور چند منظوم ترجمے شامل ہیں۔ ان کی نظموں اور غزلوں پر فیض، اختر الایمان اور جمیل مظہری کا اثر ایک حد تک نمایاں ہے لیکن یہ اپنا لہجہ ان لہجوں کو ترکیب دے کر بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ ایک خوش آئند بات ہے۔ اس مجموعے میں نظیر صدیقی کا پیش لفظ بھی شامل ہے جو شاہین کی شاعری کے ارتقا کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے اس کے علاوہ ڈاکٹر عندلیب شادانی اور حنیف فوق کی آرا بھی شامل ہیں۔ شاہین کے یہاں فکر کی تازگی کے ساتھ موضوعات کا تنوع بھی ملتا ہے۔ لہجہ شائستہ اور ذوقِ سخن نکھرا ستھرا ہے۔ اچھے صاف ستھرے اور حسین لہجے کی یہ شاعری اہلِ ذوق کے لیے کشش کا کافی سامان رکھتی ہے۔ اگر کسی شاعر کے حال سے اس کے مستقبل کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے تو ہمیں اس مجموعے کے شاعر سے مستقبل کی بہتر اور وسیع تر شاعری کی امید رکھنی چاہیے۔ کتاب بہت نفیس کاغذ پر خوبصورت کتابت و طباعت کا اچھا نمونہ ہے یہ صوری حسن کتاب کے معنوی حسن ہی کا ایک عکس ہے۔

گلِ صحرا

طالب جے پوری

قیمت: دو روپے

ملنے کا پتہ: ۸ ہیسٹنگز روڈ، الٰہ آباد

طالب جے پوری کہنہ مشق شاعر ہیں اور حبیب احمد صدیقی کے شاگرد۔ طالب صاحب کو آفتاب احمد صاحب جوہر بدایونی اور بیکل اکبر آبادی سے بھی تلمذ و مشورے کا شرف حاصل رہا ہے۔ اسی لیے احتشام صاحب کے الفاظ میں ان کا بیان متانت، پختگی، شائستگی اور احتیاط کے وہ تمام خواص جمع ہیں جو اچھی شاعری کی پہچان ہیں۔ اس مجموعے میں پچاس غزلوں اور ۸ نظموں کے علاوہ حبیب احمد صدیقی کا پیش لفظ اور خود شاعر کا ابتدائیہ بھی شامل ہے۔ ۹۶ صفحات کے اس مجموعے میں جگہ جگہ اچھے شعر مل جاتے ہیں جو روایتی ہونے کے باوجود تازگی رکھتے ہیں۔

مالک انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ و پرنٹر منیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھاپا اور پبلشر نذیر حسن نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ سے شائع کیا۔